Payam-i-Iqbal Bahria Research Journal on Iqbal Studies (BRJIS)
4(1), 36-46, 2025

اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے
(تعمیرِ خودی اور تشکیلِ ملت کے حوالے سے تحقیقی مطالعہ)

Forge Your Own World if You are Truly Alive: A Research Study on the Development of Selfhood and Nation-Building

Muhammad Akram Shad
Virtual University of Pakistan
ibnerajab5@gmail.com

Abstract

Under the proclamation "*Forge your own world if you are alive*," Allama Iqbal imparted the profound message that humanity has the power to carve out its own destiny through the strength of selfhood. This research paper aims to delve into the depths of Iqbal's philosophy of selfhood and present his ideas as a viable framework for individual and societal development in contemporary times. According to Iqbal, selfhood is not only the means of establishing individual identity but also the force that enables a person to fully realize their potential and, in turn, create their own world. The paper sheds light on how Iqbal's philosophy of selfhood empowers individuals to cultivate self-confidence, self-awareness, and creative capacities, and how these elements serve as a solid foundation for collective progress. Additionally, the paper analyzes the role of a nation's educational system in awakening the sense of selfhood within individuals and preparing them for national development. The research findings endeavour to demonstrate that Iqbal's concept of selfhood has the potential to spark a revolution not only in personal growth but also on a national level. This study proposes an educational and ethical framework, inspired by Iqbal's ideas, that empowers individuals to create their world and contribute meaningfully to collective progress.

Keywords: Iqbal, selfhood, individual & societal growth, self-confidence, creativity, education, national development

کلیدی الفاظ: اقبال، خودی، فرد اور معاشرتی تعمیر، خود اعتمادی، تخلیقی صلاحیت، تعلیم، قومی ترقی

"اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے" کے تحت، علامہ اقبال نے انسان کو خودی کی قوت سے اپنی تقدیر کو خود تراشنے کا پیغام دیا ہے۔ اس تحقیقی مقالے کا مقصد اقبال کے فلسفۂ خودی کی گہرائیوں کو جانچنا اور ان کے افکار کو موجودہ دور میں فرد اور معاشرتی تعمیر کے لیے ایک قابلِ عمل لائحہ عمل کے طور پر پیش کرنا ہے۔ اقبال کے نزدیک خودی نا صرف انفرادی شناخت کا ذریعہ ہے بلکہ یہ وہ قوت ہے جو فرد کو اپنی دنیا خود بنانے کی صلاحیت عطا کرتی ہے۔ یہ مقالہ اس بات پر روشنی ڈالتا ہے کہ کس طرح اقبال کا فلسفہ خودی وہ بنیاد فراہم کرتا ہے کہ ایک فرد اپنے اندر خود اعتمادی، خود شناسی، اور تخلیقی قوتوں کو اجاگر کر سکے، اور کس طرح یہ عناصر اجتماعی ترقی کے لیے ایک مضبوط بنیاد فراہم کرتے ہیں۔ مزید برآں، یہ مقالہ قومی تعلیمی نظام کے اس کردار کا تجزیہ کرتا ہے جو افراد کے اندر خودی کے شعور کو بیدار کرنے اور انہیں قومی ترقی کے لیے تیار کرنے میں ادا کرتا ہے۔

اس تحقیق کے نتائج یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ اقبال کا تصور خودی نا صرف فرد کی ذاتی ترقی کے لیے بلکہ قومی سطح پر بھی انقلاب برپا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اس تحقیقی کام میں اقبال کے خیالات کی روشنی میں ایک ایسا تعلیمی اور اخلاقی ڈھانچہ تجویز کیا جارہا ہے جو افراد کو اپنی دنیا خود پیدا کرنے اور اجتماعی ترقی میں بامعنی کردار ادا کرنے کے قابل بنا سکے۔

حکیم الامت کی فکر کا ایک بنیادی ستون "خودی" کا تصور ہے، جو ان کے فلسفے میں انسان کی انفرادی اور اجتماعی ترقی کا سنگِ بنیاد ہے۔ انھوں نے اپنے کلام کے ساتھ ساتھ خطبات میں بھی بارہا اس بات پر زور دیا کہ انسان اپنی تقدیر کا خود خالق ہے اور اس کی حقیقی پہچان اس وقت ممکن ہے جب وہ اپنے اندر پوشیدہ خوبی و لیاقت اور آمادگی کو کام میں لا کر اپنی تعمیری دنیا خود تخلیق کرے۔ ہمارے زیرِ تحقیق عنوان کا مفہوم نا صرف ذاتی ترقی کی جانب اشارہ کرتا ہے بلکہ یہ ہمارے لیے ایک اہم ترین سماجی انقلاب کا پیغام بھی ہے، جہاں ہر فرد ملت کے مقدر کا ستارا بن کر ایک مضبوط معاشرے کی تشکیل میں حصہ دار بن سکتا ہے۔ اقبال کے نزدیک، خودی کی مضبوطی ایک فرد کو محض ذاتی ہی نہیں بلکہ اجتماعی بہتری کے لیے ایک ایسا رستہ فراہم کرتی ہے کہ وہ ملل کے مستقبل کو ایک تابندہ ڈگر دے سکے۔ یہی وجہ ہے کہ اس مقالے میں اقبال کے فلسفہ خودی کی موجودہ دور میں اہمیت اور اس کے عملی اطلاق پر غور کیا جائے گا تا کہ ہم اس نظریے کو ایک فعال اور تعمیری معاشرتی ڈھانچے کی تشکیل میں بروئے کار لا سکیں۔

علامہ اقبال مسلم دنیا کے ایک انقلابی مفکر ہیں۔ وہ فلسفی ہیں مگر متانت و سلاست و سہولت سے فلسفہ حیات پیش کرتے ہیں۔ ان کے نظریات نہ صرف ان کے زمانے میں بلکہ آج بھی تعمیرِ خودی اور تشکیلِ ملت کے حوالے سے وقت کے ساتھ ہم آہنگ ہیں اور مستقبل میں بھی رہیں گے۔ علامہ اقبال اپنے فلسفے کے مرکز اپنے تصورِ خودی سے گزر کر ابدیت کے راستے پر جا کر اپنی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کا درس دیتے ہیں جس کے بعد خودی کی تعمیر اور ملت کی صحیح معنوں میں تشکیل کا مرحلہ آتا ہے۔ زندگی، حقائقِ حیات، آلامِ راہِ منزل، جدوجہد، اسرارِ عالَم حتٰی کہ انسان کو باور کرا دیا کہ:

مکاں فانی، مکیں آنی، ازل تیرا، ابد تیرا
خدا کا آخری پیغام ہے تُو، جاوداں تو ہے (۱)

اس موضوع کا مصرع علامہ اقبال کی پہلی اردو شعری تصنیف بانگِ درا کی ایک طویل نظم خضرِ راہ سے لیا گیا ہے۔ نظم کے آغاز میں انھوں نے ایک شاعر کے وجود کا سہارا لیتے ہوئے سلطنت، صحرانوردی اور زندگی کے ساتھ ساتھ دیگر کئی امور کے متعلق سوالات اٹھائے جن کا جواب بھی ساتھ ساتھ دے رہے ہیں۔ ہمارا موضوع بھی انھی جوابات میں سے ایک ہے جس میں اقبال نے نظریاتِ زندگی کو پیش کیا ہے کہ زندگی کوئی عارضی مظہر تو نہیں، یہ تو ایک حقیقت ہے اور ایسی حقیقت جو وجودِ انسانی میں پنہاں ہے۔ بے مقصد زندگی ان کے نزدیک موت ہے کیوں کہ مقصد انسان کو عمل وجہد پر اکساتا ہے۔ "ضربِ کلیم" میں وہ دلِ مردہ کو وہ دل ہی نہیں مانتے:

ع   دلِ مردہ دل نہیں ہے، اسے زندہ کر دوبارہ

"جاوید کے نام" وہ کہہ چکے ہیں کہ انسان دنیا میں بلا مقصد آتا ہی نہیں اور یہ ایک حقیقت ہے اور وہ مقصد اسے منزل کی طرف پیش قدمی کی ہمت دیتا ہے گویا زندگی نمودِ ظاہری کا نام نہیں، اپنی دنیا پیدا کرنے کا نام ہے:

ع ہزار گُونہ فروغ و ہزار گُونہ فراغ!

قرآن کریم قبل ازیں اس سلسلے میں رہنمائی فرما چکا ہے:وفی انفسکم ؕ افلا تبصرون(۲)(ترجمہ:اور خود تمہاری ذاتوں میں،تو کیا تم دیکھتے نہیں؟)۔

خود انسان کی اپنی ذات اور تخلیق میں بھی قدرت کی نشانیاں ہیں،ضرورت صرف انھیں دیکھنے،پہچاننے اور ان سے کام لینے کی ہے۔گویا اپنی خودی سے آشنائی کی ضرورت ہے،کائنات کے سارے رنگ اپنے وجود کے اندر دیکھنے کی ضرورت ہے،اپنے من میں ڈوب کر جھانکنے کی ضرورت ہے، تبھی انسان رازِ کن فکاں اور خودی کا ترجمان بن سکتا ہے، تبھی وہ سرِ آدم کو پا سکتا ہے:

اپنی دُنیا آپ پیدا کر اگر زِندوں میں ہے
سرِّ آدم ہے، ضمیر کُن فکاں ہے زندگی (۳)

زندگی کا حقیقی مفہوم صرف اسی صورت میں سامنے آئے گا جب اس کی اصل کو سمجھا جائے گا۔اقبال کے نزدیک زندگی ایک مکمل سفر ہے مگر مکمل ہونے سے پہلے یہ سفر کئی مراحل طے کرتا ہے اور پہلا مرحلہ ہی تعمیرِ خودی ہے جس سے انسان کو اپنی پہچان حاصل ہوگی۔ان کے نزدیک خود شناسی وہ واحد کلید ہے جو خدا شناسی کے قفل کو کھول سکتی ہے۔خالقِ ذات سے پہلے ذات کا علم ہونا عینِ فطرت بھی ہے۔اس خود آگہی کے بعد جب انسان اپنی قوائے پنہاں کو نہاں کر لیتا ہے تو وہ اپنی صلاحیتوں کو تعمیرِ ملت و تشکیلِ معاشرہ میں درست طور پر لگا سکتا ہے لیکن ان سب کے لیے انسان کو دوسروں پر قناعت کرنے کو ترک کرنا ہوگا اور آپ اپنی دنیا تخلیق کرنا ہوگی۔بہ صورت دیگر وہ کبھی اس حقیقت سے آشنا نہ ہو پائے گا کہ اسی زندگی سے حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق کا راز عبارت ہے اور اسی سے کائنات کے وجود کا یہ کرشمہ موجود ہے۔اس کے ساتھ ہی تو اقبال کہتے ہیں کہ زندگی کبھی راحت سے عبارت نہیں ہو سکتی۔ابلیس نے تو جبریل علیہ السلام سے جہانِ حیات کے بارے میں اسے "سوز و ساز و درد و داغ و جستجو و آرزو" تک کہا ہے۔گویا حیاتِ بندگان جدوجہد کا نام ہے جو پیہم چلے جس کے لیے وہ فرہاد کا حصولِ مقصد کے لیے پہاڑ کاٹ کر نہر نکالنا ہمارے سامنے لاتے ہیں۔علامہ نے اپنی دنیا پیدا کرنے کی طرف رہنمائی ہی نہیں کی بلکہ مسلمانانِ برِصغیر کی "ذہنی خدمت" کی۔انھوں نے گفتار میں بھی اپنے اسی نظریہ حیات کی ترویج کی۔ایک موقع پر ۱۹۲۳ میں اخبار "زمیندار" کو ایک مکتوب میں اقتصادیات کے مسائل کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"ہندوستان اور دیگر ممالک کے مسلمان جو یورپ کی پولیٹیکل اکانومی پڑھ کر مغربی خیالات سے فوراً متاثر ہو جاتے ہیں ان کے لیے لازم ہے کہ اس زمانے میں قرآن کریم کی اقتصادی تعلیم پر نظر غائر ڈالیں۔مجھے یقین ہے کہ وہ اپنی تمام مشکلات کا حل اس کتاب میں پائیں گے۔"(۴)

اپنی نظم "ارتقا" میں اقبال نے زندگی کا انداز ہی شعلہ مزاج،ہنگامہ خیز اور غیور بتایا ہے۔ان کے مطابق مشکلات اور دشواریاں زندگی کی سرشت میں ہیں حتٰی کہ رات کی خاموشی ہی کو دیکھا جائے تو کتنی پر سکون لگتی ہے مگر اس کی خاموشی میں بھی آہیں ہوتی ہیں۔ایک حقیقت یہ بھی ہے کہ حلب کی مٹی سے آئینہ بنایا جاتا ہے مگر مٹی سے آئینے تک کتنی ہی منازل عبور کرنا ہوتی ہیں۔دیکھا جائے تو شراب بنانے والے انگور سے پانی ہی بنا رہے ہوتے ہیں مگر عملی طور پر وہ ستارے بنا رہے ہوتے ہیں وہ بھی سورج کو توڑ کر۔

ع ستارہ می شکنند، آفتاب می سازند

ملتِ اسلامیہ کی زندگی اور عروج، زندگی کی اسی مسلسل جدوجہد سے عبارت ہے۔ اگر زندگی سے یہ کشاکش پیہم نکال دی جائے تو شاید تعمیر و تشکیلِ ملت ممکن ہی نہ رہے۔ اقبال نے اپنی دنیا آپ پیدا کرنے کے لیے ہی زمین پر آنے والی مشکلات، جذبات میں آنے والی شدت اور اقوام کی تشکیل و تعمیر میں آنے والی مساعی کی تصویر کشی یوں کی:

اسی کشاکشِ پیہم سے زندہ ہیں اقوام
یہی ہے رازِ تب و تابِ مِلّتِ عربی(۵)

اقبال کا یہ پیغام تو زندوں کے لیے ہے۔ ان کے کلام کے باطنی ہی نہیں، ظاہری معانی بھی یہی ہیں کہ اگر تو زندوں میں ہے تو اے مسلمان! اپنی دنیا آپ پیدا کر۔ ایک ایسی دنیا جو ترکِ دنیا، بے عملی اور مریضانہ تعلیم سے دور ہو اور جو خانقاہیں ایسی مفسد تعلیمات دیں ان سے بھی گریز ضروری ہے تبھی اقبال کسی بھی پیر خانے میں نہ ٹھہر سکنے کی اپنی ایک وجہ بتاتے ہیں:

ع کہ ہے ظریف و خوش اندیشہ و شگُفتہ دماغ

ایسا کیوں ہے؟ کیوں کہ اقبال تو تعلیمِ عمل کے سب سے بڑے نقیب ہیں جو زندگی کے جنت اور جہنم بننے کے لیے ایک ہی چیز کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہیں اور وہ عمل پیہم ہے۔ عمل ہی سے زندوں کی دنیا پیدا ہو سکتی ہے، عمل ہی سے ملت کی از سرِ نو شیرازہ بندی ممکن ہے اور اسی سے صحت مند معاشرے کی تشکیل عمل میں لائی جا سکتی ہے جب کہ تن آسانی انھیں لہو رونے پر مجبور کر دیتی ہے۔ محنت ہی سے اپنی دنیا پیدا کی جا سکتی ہے اور جو اقبال نے کہہ دیا وہ حقیقت بن گیا؛ تو کیا یہ حقیقت نہیں کہ اپنے ہی لہو میں جلنے کا نام شباب ہے؟ بلاشبہ حقیقت ہے، اور اپنی دنیا پیدا کرنے کے رازوں میں سے ایک راز بھی ہے۔

اپنی دنیا آپ پیدا کرنے کے لیے اقبال کی نظر میں خاص تعلق باللہ کی بھی ضرورت ہے۔ اقبال دیگر صوفی شعراء کی مثل اللہ کے ساتھ کسی خاص ضابطے کے تحت یہ تعلق قائم نہیں کرتے بلکہ ان کے افعال وخیالات اللہ تعالٰی کے اپنے بندوں کے شہ رگ سے بھی قریب ہونے پر دال ہیں۔ اللہ پاک سے دور ہونا بس یہ بتاتا ہے کہ انسان اس ذات کو جانتے تو خوب ہیں مگر ان کا یقین مضبوط نہیں ہے۔ اقبال خودی کے پیرائے میں اس تعلق و تخیل کے تصور کو اس طرح پیش کرتے ہیں کہ انسان اپنی ذات و وجود سے الگ اور جدا نہیں ہوتے۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال کا خدا کے ساتھ مکالمہ دیگر شعراء اور صوفیوں سے مختلف ہے۔ وہ خدا سے بات کرتے ہوئے اپنے مقام کو برقرار رکھتے ہیں، جو انسانیت سے ازل سے جڑا ہوا ہے۔

اقبال نے اپنی دنیا آپ پیدا کرنے کے لیے جن عناصر کو لازمی قرار دیا ان میں خودی کی دریافت، عشقِ الٰہی، عشقِ رسول ﷺ، علم، عمل، مردِ مومن، مردِ قلندر وغیرہ شامل ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اسلام انھیں سب سے زیادہ عزیز ہے اور اسی کو وہ معتبر جانتے ہیں۔ اقبال نے اپنی دنیا آپ پیدا کی اور زندوں میں اپنا شمار کرا کے دکھا دیا۔ انھوں نے اپنی خودی کو دریافت کرنے کا دعوٰی سچ کر دکھایا:

اسی اقبالؔ کی مَیں جُستجو کرتا رہا برسوں
بڑی مُدّت کے بعد آخر وہ شاہیں زیرِ دام آیا(۶)

اقبال کی شاعری میں اپنی پیدا کی گئی دنیا کے لوگوں کی محبت کا محور و مرکز ذاتِ الٰہی ہے، لیکن اقبال اپنے جذبات اور خواہشات کو بے بسی سے اللہ کے سامنے پیش نہیں کرتے بلکہ ان کے اللہ کے ساتھ دوستانہ تعلقات بہت گہرے ہیں۔ یہاں وہ اللہ کی محبت میں اتنے مگن ہیں کہ ان کی جستجو کا دائرہ اللہ سے قریبی تعلق تک پہنچ جاتا ہے۔ اور یہ غیر معمولی قوت دنیا میں بے چینی پیدا کر چکی:

ع   کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبینِ نیاز میں

در حقیقت یہ ایک عام عاشق کی آواز نہیں ہے بلکہ وہ شخص اللہ تک رسائی حاصل کر چکا ہے اور فطرت کی کھوج کا فرض انجام دے چکا ہے۔ اس کے بعد دستِ مسلمان دستِ رحمٰن بن جاتا ہے۔ یہ وہی ہاتھ ہے جس سے وہ اپنی دنیا آپ پیدا کرنے کا اہل ہو چکا ہوتا ہے۔ وہ اللہ عزوجل کی بنائی ہوئی دنیا ہی سے ایک نئی دنیا تخلیق کرتا ہے۔ اللہ پاک نے رات، مٹی، صحرا، کہسار، پتھر اور خس کو پیدا کیا جب کہ اقبال نے اپنی خودی کی شناخت وحفاظت کی اور رات کے لیے چراغ، مٹی سے پیالہ، صحرا سے باغات بنا دیے، اپنی دنیا میں وہ ایسا پتھر ہیں جو آئینہ بنائے اور زہر سے تریاق تخلیق و ایجاد کرے:

بیابان و کہسار و راغ آفریدی   خیابان و گلزار و باغ آفریدم
من آنم کہ از سنگ آئینہ سازم   من آنم کہ از زہر نوشینہ سازم (۷)

ترجمہ: تونے صحرا اور پہاڑ اور جنگل تخلیق کیے میں نے ان میں کیاری اور پھلواری اور باغ بنائے۔ میں وہ ہوں کہ پتھر سے آئینہ بناتا ہوں، میں وہ ہوں کی زہر سے تریاق نکالتا ہوں۔

جہاں تک کسی زندہ کی دنیا پیدا کرنے کے قرائن و دلائل کا سوال ہے، سید عابد علی عابد نے اسی دنیا کو آزاد وطن، آزاد ہند و پاکستان اور آزاد مملکت ہائے اسلام ثابت کیا ہے جو اقبال نے آپ ہی پیدا کی۔ اقبال کے شعورِ تخلیق کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں:

> اس دور میں اقبال نے بہ وثوقِ تمام محسوس کیا کہ فرنگی تخیلات اور تصورات کے خلاف انھوں نے جو جہاد کیا ہے، عموماً ممالک اسلامیہ اس سے متاثر ہوئے ہیں۔ ہند و پاکستان میں مسلمانوں کے لیے ایک وطن کی تحریک آگ کی طرح پھیلتی جا رہی ہے اور تمام ممالکِ اسلامی اس تحریک سے متاثر نظر آتے ہیں۔(۸)

اقبال وہ فرمان کچھ یوں فرماتے ہیں:

اہلِ حرم سے اُن کی روایات چھین لو
آہُو کو مرغزارِ خُتن سے نکال دو(۹)

علامہ حقیقت پسند ہیں، حقیقت کو کھوجنے اور حقیقت پر مبنی دنیا تخلیق کرنے کا درس دیتے ہیں۔ اسی صورت میں فرد خود کو پا سکتا ہے اور اسی صورت میں معاشرے کی تشکیل و تعمیر ہو سکتی ہے۔ ان کا ماننا ہے کہ ذاتِ باری تعالیٰ نے انسان کو بصیرت عطا کی ہے اور اگر انسان اپنی دنیا پیدا کرنا چاہتا ہے تو اسے اس بصیرت سے حتی المقدور کام لینا ہو گا۔ اگر وہ ایسا کرتا ہے تو وہ فطرت کے باریک حجاب کے پیچھے چھپی ہوئی حقیقتوں کو پالے

گا۔ جس طرح وہ ظاہری عقل سے مادی اشیا کی حقیقت حاصل کر کے نئی ایجادات کا رستہ کھول لیتا ہے اسی طرح بصیرت سے وہ کائنات کی پنہاں اشیاء کی حقیقت بھی خود پر آشکار کر کے نئی دنیا اور نیا معاشرہ تشکیل دے سکتا ہے کیوں کہ فطرت کا حجاب بہت باریک ہے:

یہ دنیا دعوتِ دیدار ہے فرزندِ آدم کو
کہ ہر مستور کو بخشا گیا ہے ذوقِ عُریانی(۱۰)

حقیقت یہی ہے کہ عہدِ اقبالی میں ہندوستان کے مسلمان کے لیے اس خطے میں اسلام کے اور خود اپنے وجود کی بقا کے لیے اپنے زندہ ہونے اور آپ اپنی دنیا پیدا کرنے کے علاوہ کوئی دوسرا حل بھی نہیں تھا۔ کیوں کہ جب تک ہاتھ میں قوت نہ ہو تب تک کوئی اپنا محافظ بن سکتا ہے نہ اپنے دین کا۔ اسے شریعت کا بھی پابند ہونا پڑے گا اور خودی کی حفاظت بھی کرنی پڑے گی۔ ڈاکٹر شجاع ناموس نے خوب لکھا تھا:

> اصل میں ہندوستان کا اسلام عجیب مصیبت میں گرفتار ہے۔ جو کہیں خطہ عالم میں نظر نہیں آتی۔ یعنی اس کے حالات اور اس لیے تکالیف مخصوص ہیں۔ ادھر غیر قوم کی حکومت، دوسری طرف غیر مذہب کا دباؤ اور ان کا ساتھ پھر اسلامی مذہب کا ملّاؤں کے ہاتھوں تنزل اور ملت کے اندر فرقہ بندی۔ اس تمام انتشار اور ابتزال کے ساتھ حصول آزادی و ترقی کی خواہش گم۔ گویا ضمیر میں انکساری موجود اور خودی غائب۔(۱۱)

احساسِ خودی صرف فرد کے لیے ضروری نہیں بلکہ یہ احساس ملت و معاشرے میں بھی بہت ضروری ہے اور یہی ملی حیات کا کمال ہو گا۔ یہ احساس بھی صرف اسی صورت پیدا ہو سکتا ہے اور معاشرہ مجموعی طور پر تعمیر و تشکیل کی طرف گامزن ہو سکتا ہے جب اپنی ملی روایات کی پاسداری کی جائے گی۔ یہ حیات جس سے ملل زندہ رہتی ہیں فطرت کی قوتوں کی تسخیر سے ہی ممکن ہے۔ قرآن مجید بھی سورہ لقمان میں یہی درس دیتا ہے جسے علامہ نے اپنا شعار بنایا۔ اسی سے ایک نئی دنیا پیدا کی جا سکتی ہے اور یہی زندگی کو زندہ رکھنے کا ذریعہ ہے:

> (لوگو!) کیا تم نہیں دیکھتے کہ اللہ نے تمہارے لئے ان تمام چیزوں کو مسخّر کر دیا ہے جو آسمانوں میں اور جو زمین میں ہیں، اور اس نے اپنی ظاہری و باطنی نعمتیں تم پر تمام کر دی ہیں۔(۱۲)

برائے تخلیقِ کائنات، تسخیرِ کائنات بھی غیر ضروری نہیں ہے کیوں کہ دنیا بہر حال کائنات کا ایک حصہ ہوتی ہے۔ علامہ اقبال تو قرآن مجید کی رو سے صرف ایک دنیا کی تخلیق پر اکتفا کیے بغیر پوری کائنات کو مسخر کرنا چاہتے ہیں اور یہی درس دیتے ہیں:

ماسوا از بہر تسخیر است و بس
سینہ او عرضہ تیر است و بس(۱۳)

ترجمہ: خدا کے سوا جو موجودات ہے وہ اسی لیے ہے کہ اسے تسخیر کیا جائے اور اس کا سینہ تیروں کا نشانہ ہے۔

غنچہ از خود چمن تعبیر کن
شبنمی خورشید را تسخیر کن(۱۳)

ترجمہ: تو غنچہ ہے تو اپنے آپ کو باغ سمجھ، تو شبنم ہے تو سورج کو قبضے میں لا۔

اس کے باوجود کہ علامہ انسان سے کہہ رہے ہیں کہ انسان کی ذات بہت محدود ہے لہٰذا یہ ضروری امر ہے کہ اس محدود ذات میں وسعتیں پیدا کی جائیں اور اپنے کاروبارِ حیات کو آسان بنایا جائے گویا اپنی دنیا آپ پیدا کی جائے تو ان سب کے لئے اور اپنی دنیا کی تخلیق کے لیے عناصرِ کائنات پر سلطانی و حکمرانی ضروری ہے، نئی دنیا کی تخلیق کے لیے وسعتِ حیات ضروری ہے اور اس کے لیے تسخیرِ عناصرِ کائنات ضروری ہے۔ علامہ فرماتے ہیں:

تنگی ات پہنا پذیرد در جہان
کار تو اندام گیرد در جہان(۱۴)

ترجمہ: اے مخاطب تیری تنگی اس دنیا میں پھیلاؤ اختیار کرتا کہ تیرا کام آراستہ ہو جائے۔

اپنی خودی کی شناخت و دریافت و تعمیر و تکمیل کے بعد اپنی دنیا کی تخلیق اور معاشرے کی حیات کے لیے عمل و جہد و عشق کے بعد جس چیز کے بغیر یہ تخلیق ممکن نہیں وہ علم اور تعلیم ہے۔ اقبال بے شک ایک پیشہ ورانہ ماہرِ فنِ تعلیم نہ تھے لیکن انھیں جن چیزوں سے سب سے زیادہ دلچسپی رہی ان میں نمایاں چیز تعلیم ہے۔ وہ اپنے دور کے نظامِ تعلیم کے نقاد بھی تھے اور ایک استاد بھی البتہ وہ تعلیم اور تدریس کے معاملے میں ایک مصلح مدرس تھے۔ انھوں نے معاشرے کی تعمیر و ترقی کے لیے تعلیم اور نظامِ تعلیم پر بہت زور دیا۔ ان کا فلسفہ تعلیم قرآنی و اسلامی ہے۔ مغربی تہذیب میں موجود اعلیٰ ترین اصولوں کی بنیاد بھی اسلام اور اسلامی نظامِ تعلیم و علوم ہی کو قرار دیتے ہیں۔ مقالاتِ اقبال میں درج ہے کہ:

اس زمانہ میں مسلمانوں نے اس مبحث پر بہت کچھ لکھا ہے کہ اسلام اور علومِ جدیدہ کے مابین کیا تعلق ہے۔ میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ اسلام مغربی تہذیب کے تمام عمدہ اصولوں کا سرچشمہ ہے۔(۱۵)

اسلام میں تعمیرِ سیرت و کردار پر بہت زور دیا گیا ہے۔ اسی لیے شیخِ مکتب کا بھی یہی کام ہے وہ روحِ انسانی کو پروان چڑھاتا ہے یعنی ایک استاذ کی کاریگری کی اصل صنعت روحِ انسانی ہے۔ اقبال کا بھی یہ نظریہ ہے کہ تعلیم کو مذہب ہی کے تابع ہونا چاہیے لیکن جدید علوم ضرور حاصل کرنے چاہئیں، علومِ جدیدہ کی سرمستیوں کو گناہ نہ کہتے ہوئے فرماتے ہیں:

اسی سُرور میں پوشیدہ موت بھی ہے تری
ترے بدن میں اگر سوزِ 'لاالہٰ' نہیں (۱۶)

اسی حوالے سے محمد احمد خاں نے بھی اقبال کی تعلیمات و افکار سے بڑا دلچسپ اور حقیقی نتیجہ اخذ کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"اس دنیا میں قابلِ غور و فکر دو ہی چیزیں ہیں: ایک تو ذہنِ انسانی یعنی نفس اور دوسرے ذہنِ انسانی سے باہر جو کچھ ہے یعنی آفاق۔ کامیابی کی کلید انہی دو کا علم ہے۔ علم النفس اور علم آفاق یہی دو بنیادی علوم ہیں۔"(۱۷)

علامہ اقبال کی تعلیمات کے حوالے سے محمد احمد خاں کی یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ علمِ النفس میں روحانیت اور نفسیات جیسے علوم جب کہ علم آفات میں سائنس کے علوم آتے ہیں یعنی فراغت سے کچھ حاصل نہ ہوگا، روح و مادہ دونوں کے علوم کا حصول ضروری ہے۔ جہاں تک اقبال کے عہد میں موجود نظامِ تعلیم کا تعلق ہے، علامہ اقبال نے اس نظام کے کچھ نقائص نمایاں کیے ہیں جیسے موجودہ نظام تعلیم نے لوگوں کو جذبہ خودی سے محروم کر دیا، روحانیت کے بجائے مادہ پرستی کو ترویج دی جس سے افکاری قوت میں کمی واقع ہوئی ہے، مغربی تہذیب کا دیوانہ پن جنم لے چکا ہے،

اور صرف علم برائے معاش کی بنیاد ڈالی گئی ہے۔ وہ صرف طلبہ ہی کی تعلیم نہیں بلکہ اساتذہ کی بھی تربیت چاہتے تھے۔ تبھی ایک گلہ بھی کر دیا کہ لا اِلہ الا اللہ کی صدا کے لیے اساتذہ وہ نہیں جو اس صدا کو پیدا کرنے کا باعث بنتے، یہ تو مادہ پرست ہیں اور اسی زعم میں اہلِ حق بننے والوں کا خود گلا گھونٹ رہے ہیں۔ اب کہاں سے سرداری ملے گی اور کہاں سے اپنی دنیا پیدا ہو گی کہ:

ع یہاں فقط سرِ شاہیں کے واسطے ہے کُلاہ (۱۸)

اقبال تو اس تعلیم اور نظامِ تعلیم کے خواہاں ہیں کہ جس کے عناصر میں حریت، مذہبیت و روحانیت کا فہم، مغربیت سے چھٹکارا، ملی تشخص اور مقصدِ حیات کا شعور شامل ہوں۔ وہ ایک ذرے سے ایک نئی دنیا تعمیر کرنے کا درس دیتے ہیں۔ ان کی نظر میں آدم علیہ السلام نے بھی پہلے مادی دنیا کو سمجھنے کے لیے مساعی کیں تاکہ انہیں تسخیر کریں تب یہی آب و گل کی دنیا اہلِ علم و فن کے لیے تختہ تعلیم بنی۔ اقبال جھنجھوڑتے ہوئے کہتے ہیں کہ اٹھ جا اے غافل! یہ کائنات حقیقی ہے اور اس کی پیدائش کا مقصد بھی مسلمان کی تعلیم و تربیت ہے:

عقدہ محسوس را اول کشود
ہمت از تسخیر موجود آزمود (۱۹)

ترجمہ: اس نے محسوس کی گتھی سب سے پہلے سلجھائی، پھر موجود کی تسخیر میں حوصلہ و ہمت کی آزمائش کی۔

غایتش توسیع ذات مسلم است
امتحان ممکنات مسلم است (۱۹)

ترجمہ: اس کا مقصد یہ ہے کہ مسلمان کی ذات توسیع پائے اور اس کے ممکنات کی آزمائش کی جا سکے یعنی دیکھا جا سکے کہ اس میں کتنی قوت کتنی صلاحیت ہے۔

اقبال کے نزدیک خودی کی تعمیر محض فرد کی اصلاح تک محدود نہیں بلکہ اجتماعی تشکیل کا ایک ناگزیر مرحلہ ہے۔ وہ فرد کی خودی کو ملت کی شیرازہ بندی اور ترقی کا سنگِ بنیاد سمجھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے فکری نظام میں فرد اور معاشرہ ایک دوسرے سے منسلک نظر آتے ہیں۔ ان کے ہاں خودی کا تصور صرف روحانی بالیدگی کا ذریعہ نہیں بلکہ ایک ایسا عملی اصول بھی ہے جو اقوام کے عروج و زوال میں فیصلہ کن کردار ادا کرتا ہے۔ صلاح الدین احمد نے اپنی کتاب "تصوراتِ اقبال" میں اسی نکتے کو اجاگر کیا ہے کہ اقبال کی تعبیرِ خودی درحقیقت ان کے تصورِ معاشرت کا ایک لازمی اور مثبت پہلو ہے۔ یہ تصور محض فرد کی حد تک محدود نہیں بلکہ قومی اور ملی سطح پر بھی کار فرما ہے۔ اقبال کا یہی پیغام فرد کو محض اپنی ذات کی تعمیر پر اکتفا کرنے کے بجائے معاشرتی تشکیل میں عملی کردار ادا کرنے کی ترغیب دیتا ہے، تاکہ ملت اپنی اصل شناخت اور وقار حاصل کر سکے۔ صلاح الدین احمد یوں رقمطراز ہیں:

"آج اقبال کی شاعری کی جس ممتاز خصوصیت کا سب سے زیادہ چرچا ہے اور جو شہرت کے پروں پر ہند سے عجم اور عجم سے فرنگ تک جا پہنچی ہے۔ وہ مسلمہ طور پر ان کی تعبیرِ خودی ہے لیکن غور کیجیے تو شاعر کا یہ محبوب نظریہ جسے وہ کبھی فرد کے ارتقائے روحانی کی بنیاد اور کبھی اقوام کے عروج و زوال کا محور قرار دیتا ہے، اس کے تصورِ معاشرت ہی کا ایک جمیل اور مثبت پہلو ہے۔ خواہ یہ معاشرت انفرادی ہو یا اجتماعی، قومی ہو یا ملی، جوارِ کعبہ میں فروغ پائے یا بت کدہ ہند میں۔" (۲۰)

اقبال کے فلسفہ ٔخودی کی بنیاد اس نظریے پر ہے کہ فرد کی حقیقی ترقی کا آغاز خودی کی پہچان اور اس کی تعمیر سے ہوتا ہے، جو بالآخر ایک مضبوط اور خود مختار معاشرے کی تشکیل کا ذریعہ بنتی ہے۔ خودی، محض فرد کی شناخت تک محدود نہیں بلکہ ایک ایسا فکری و عملی نظام ہے جو ملت کی مجموعی بیداری اور استحکام میں بھی کلیدی کردار ادا کرتا ہے۔ جب ایک فرد اپنی خودی کو پہچان کر اسے جِلا بخشتا ہے تو وہ صرف ذاتی ترقی پر اکتفا نہیں کرتا، بلکہ اپنی تمام صلاحیتوں کو ملت کی فلاح و بہبود کے لیے بروئے کار لاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال بار بار خودی کی تعمیر پر زور دیتے ہیں، کیونکہ ایک خوددار اور خود مختار فرد ہی ایک طاقتور قوم کی بنیاد رکھ سکتا ہے۔ اسی حقیقت کو مولوی احمد دین نے علامہ اقبال پر لکھی اولین باقاعدہ تصنیف، اپنی کتاب "اقبال" میں اجاگر کیا ہے، جہاں وہ خودی کے تصور کو عملی زندگی میں نافذ کرنے کی ضرورت پر زور دیتے ہیں۔ وہ اس بات کی وضاحت کرتے ہیں کہ خودی کا شعور انسان میں ایک نئی دنیا بسانے کا حوصلہ پیدا کرتا ہے، جس میں وہ دوسروں کی محتاجی سے آزاد ہو کر اپنی زندگی کا رخ خود متعین کرتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"خودی۔۔۔ اور اس خودی کے احساس کو مسلم کے دل میں پیدا کر کے اسے بتایا گیا ہے کہ وہ علو ہمت سے کام لے۔ خود اپنے دل کے اندر نئی دنیا بنالے۔ نئے جذبات ہوں، نئے نئے ولولے ہوں، نئے ہنگامے ہوں، اپنی فطرت کے تجلی زار میں آباد ہو اور اغیار کی محتاجی سے قطعاً آزاد۔ کسی کے پاس حاجت لے جانے سے، چاہے جان بچانے کے لیے ہی کیوں نہ ہو، مرنا بہتر سمجھے۔ اگر خودداری اس کا عمل ہو گا، اگر خودی کا احساس اسے میسر ہو گا تو مصیبت میں درجات برکت، اور افتادگی میں سامانِ سرفرازی ملیں گے۔"(۲۱)

علامہ اقبال نے اپنے خطبات میں صنعتی و تجارتی تعلیم کی ترویج کی سفارشات بھی پیش کیں۔ طلبہ کے لیے اخلاقی قدروں پر مشتمل بلند نظری کی حامل وہ تعلیم چاہتے تھے جو ان کی کردار سازی کرے اور شخصیت کو نکھارے۔ تعلیمِ نسواں کو ضروری خیال کرتے تھے مگر ایسی تعلیم جو مذہبی و اخلاقی ہونے کے ساتھ ساتھ معاشرے کے لیے بھی کارآمد ہو۔ البتہ انھوں نے مخلوط تعلیم کی حمایت نہیں کی۔ اس معاملے میں ان کے تعلیمی نظریات یہاں سے بھی واضح ہوتے ہیں:

جس عِلم کی تاثیر سے زن ہوتی ہے نازن
کہتے ہیں اُسی علم کو اربابِ نظر موت(۲۲)

اگر مزید اقبال کے مقاصدِ تعلیم کو دیکھا جائے تو تو یہ حقیقت کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ علم کا مقصد دو چیزوں کی حفاظت کے اسباب پیدا کرنا ہے؛ زندگی اور خودی۔ علم اور فن زندگی کے خدمت گزار ہوتے ہیں۔ اسرارِ خودی میں فرماتے ہیں:

علم و فن از پیش خیزان حیات
علم و فن از خانہ زادان حیات(۲۳)

ترجمہ: علم اور فن تو زندگی کے خدمت گار اور اسکے غلام ہیں۔

تحقیقی مقالہ کا موضوع بھی اقبال کے فلسفے کا وہ اہم پہلو سامنے لاتا ہے، جو انسان کی خودی، خود شناسی اور خود مختاری پر مبنی ہے۔ علامہ اقبال نے ان افکار میں نوعِ انسان کی ذاتی اور اجتماعی ترقی کا دارومدار اس بات پر رکھا کہ انسان اپنی دنیا خود تخلیق کرے، اور اپنی زندگی کا مقصد خود طے کرے۔ اس مقالے کے توسل سے سعی کی گئی ہے کہ اقبال کے نزدیک خودی کی تعمیر اور تقویت انسان کو نہ صرف انفرادی طور پر بہتر بناتی

ہے بلکہ وہ اجتماعی طور پر بھی باعثِ راحت و اصلاح و فلاح کائنات ہو سکتا ہے۔ اقبال کا یہ پیغام نا صرف انفرادی خود مختاری کا ہے بلکہ ایک سماجی اور انقلابی پیغام بھی ہے جو قوم کو اپنی تقدیر خود سنوارنے کا درس دیتا ہے۔ "اپنی دنیا آپ پیدا کر" کے پیچھے اقبال کا یہ نظریہ پوشیدہ ہے کہ انسان کی حقیقی ترقی اس وقت ممکن ہے جب وہ ذاتی اہلیت کو کام میں لا کر اپنے گردوپیش میں بہتری لائے۔

تحقیقی مطالعے کے دوران یہ امر واضح ہوتا ہے کہ اقبال کا تصورِ خودی محض ایک فلسفیانہ نظریہ نہیں بلکہ ایک عملی منشور ہے، جو فرد اور معاشرے دونوں کے لیے راہنمائی فراہم کرتا ہے۔ اقبال کے نزدیک خودی کی پرورش فرد کی فکری، روحانی اور عملی ترقی کی بنیاد ہے، جو بالآخر قومی اور ملت کی سطح پر ایک مثبت تبدیلی کا پیش خیمہ بنتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال کے فلسفے میں خودی، خود مختاری اور تخلیقی عمل کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ تاہم، اقبال کا یہ فلسفہ نہایت وسیع اور گہرائی لیے ہوئے ہے، اور اس پر مختلف زاویوں سے تحقیق کی جاسکتی ہے۔ اقبال کی شانِ تفکر کو محض ایک مقالے میں سمو لینا ممکن نہیں، لہٰذا اس تحقیق میں خاص طور پر تعمیرِ خودی سے تشکیلِ ملت تک کے تجزیاتی و تحقیقی مطالعے کو شامل کیا گیا ہے، تاکہ اقبال کی فکر کے ان بنیادی نکات کو اجاگر کیا جاسکے جو آج بھی ہماری انفرادی اور اجتماعی ترقی کے لیے ناگزیر ہیں۔

مقالے میں یہ بھی ظاہر ہوا ہے کہ اقبال کے نزدیک انسان کی خودی اس کی پہچان کا محور ہے اور اسی خودی کے ذریعے وہ خدا کو پہچان سکتا ہے۔ انسان جب اپنی خودی کی تلاش میں نکلتا ہے تو وہ اپنی اندرونی صلاحیتوں کو بہتر طور پر سمجھ پاتا ہے اور ان صلاحیتوں کو انسانیت اور ملت کی خدمت میں لگا کر کسی کا مرہونِ منت ہوئے بغیر بآسانی اپنی دنیا آپ پیدا کر سکتا ہے۔۔ اس میں ایک اور اہم نقطہ یہ سامنے لانے کی بھی کوشش کی گئی ہے کہ اقبال کی نظر میں زندگی، فراغت نہیں، یہ پیہم جدوجہد اور مستقل عمل ہے۔ اقبال نے فرہاد کے قصے کی مثال دے کر یہ پیغام دیا کہ مشکلات اور دشواریاں زندگی کا حصہ ہیں، لیکن یہی انسان میں وہ جوہر پیدا کرتی ہیں کہ وہ اپنی دنیا خود تخلیق کر سکے۔ مزید برآں، یہاں جو قرآن کریم کی آیت "وفی انفسکم افلا تبصرون" کا حوالہ دیا گیا ہے، گویا اقبال کے فلسفے کی جڑیں اسلامی تعلیمات میں پیوست ہیں۔ یہ آیت انسان کو اپنی ذات میں غور و فکر کرنے اور اپنی اندرونی صلاحیتوں کو پہچاننے کی دعوت دیتی ہے، فلسفہ اقبال کا بنیادی حصہ یہی ہے۔ علامہ اقبال انسانی ضمیر سے اس نئی دنیا کا خمیر اٹھانے کا عندیہ دیتے ہیں جس کا اظہار وہ گوئٹے کے ضمن میں لکھی اپنی فارسی تصنیف "پیامِ مشرق" کے دیباچہ میں خود فرما چکے ہیں:

"ناظرین خود اندازہ کر لیں گے کہ اس کا مدعا زیادہ تر ان اخلاقی، مذہبی اور ملی حقائق کو پیشِ نظر لانا ہے جن کا تعلق افراد و اقوام کی باطنی تربیت سے ہے۔"(۲۴)

آخر میں تحقیق اس پر منتج ہوتی ہے کہ اقبال کا فلسفہ فی زمانہ اتنا ہی اہم ہے جس قدر ان کے زمانے میں تھا۔ اقبال کا پیغام یہ ہے کہ اگر انسان اپنی خودی کو مضبوط کرے، اپنی دنیا خود تخلیق کرے، اور اپنی زندگی کا مقصد خود طے کرے، تو وہ نہ صرف اپنی زندگی میں کامیاب ہو سکتا ہے بلکہ وہ قوم کی ترقی اور ملت کی تعمیر میں بھی اہم کردار ادا کر سکتا ہے۔ اس تحقیق میں یہ درس ہے کہ تخلیقِ دنیائے نَو کے لیے اہم یہ ہے کہ ہم خود مختاری، خودی کی مضبوطی، اور خدا سے تعلق کو مضبوط کریں، مزید یہ کہ حصولِ علوم کو خود پر لازم قرار دیں تاکہ ہم دین، دنیا اور آخرت تینوں میں کامیاب ہو سکیں۔ یہی ہماری اپنی تخلیق کی ہوئی دنیا ہو گی۔ اقبال کی تلخ نوائی یقیناً بیمار کے لیے شفا کا کام دیتی ہے، انھی کے اشعار نے کئی دنیاؤں کی بنیاد کا کام کیا ہے:

سما سکا نہ دو عالم میں مردِ آفاقی نہ چینی و عربی وہ، نہ رومی و شامی (۲۵)

اور

چمن میں تلخ نوائی مری گوارا کر — کہ زہر بھی کبھی کرتا ہے کارِ تریاقی
عزیز تر ہے متاعِ امیر و سُلطاں سے — وہ شعر جس میں ہو بجلی کا سوز و برّاقی(۲۵)

حوالہ جات

۱۔ محمد اقبال، علامہ: کلیات اقبال اردو، (لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، ۲۰۱۳ء)، ص۲۹۹

۲۔ القرآن المجید: سورہ الذاریٰت سورہ نمبر ۵۱، آیت نمبر ۲۱

۳۔ کلیات اقبال اردو (بانگِ درا)، محولہ بالا، ص۲۸۷

۴۔ محمد رفیق افضل (مرتب): گفتارِ اقبال، (لاہور: ادارہ تحقیقاتِ پاکستان، ۱۹۷۷ء)، ص۸

۵۔ کلیات اقبال اردو، محولہ بالا، ص۲۵۱

۶۔ ایضاً، ص۳۸۶

۷۔ محمد اقبال، علامہ: کلیاتِ اقبال فارسی، (لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز پبلشرز،)۱۹۸۱ء، ص ۲۸۴

۸۔ عابد علی عابد، سید: شعر اقبال، (لاہور: اظہر سنز پرنٹرز، ۱۹۹۳ء)، ص۳۰۷

۹ کلیات اقبال اردو، محولہ بالا، ص۶۵۸

۱۰۔ ایضاً، ص۷۵۴

۱۱۔ شجاع ناموس، ڈاکٹر: اقبال کا پیغام، مشمولہ "اقبالیات" شمارہ نمبر ۳، جولائی ۲۰۰۴ء، ص۳۰

۱۲۔ القرآن المجید: سورۃ لقمان سورۃ نمبر ۳۱، آیت نمبر ۲۰

۱۳۔ کلیات اقبال فارسی، محولہ بالا، ص۱۴۱

۱۴۔ ایضاً، ص۱۶۴

۱۵۔ محمد اقبال، علامہ: مقالاتِ اقبال مرتبہ سید عبدالواحد معینی مع محمد عبداللہ قریشی، (لاہور: آئینہ ادب، ۱۹۸۲ء)، ص۲۸۰

۱۶۔ محمد اقبال، علامہ: کلیات اقبال اردو، (لاہور: اقبال اکادمی پاکستان،)، ص۶۹۰

۱۷۔ محمد احمد خاں: اقبال اور مسئلہ تعلیم، (لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، ۱۹۷۸ء)، ص۲۹

۱۸۔ محمد اقبال، علامہ: کلیات اقبال اردو، (لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، ۱۹۹۴ء)، ص۳۷۷

۱۹۔ کلیات اقبال فارسی، محولہ بالا، ص۱۴۱

۲۰۔ صلاح الدین احمد، : تصوراتِ اقبال، (علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۱۹۷۴ء)، ص۸۶

۲۱۔ احمد دین مولوی: اقبال مرتبہ مشفق خواجہ، (کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۷۹ء)، ص۱۷۹

۲۲۔ کلیات اقبال اردو، محولہ بالا، ص۶۰۸

۲۳۔ کلیات اقبال فارسی، محولہ بالا، ص۱۷

۲۴۔ محمد اقبال، علامہ: پیامِ مشرق، (لاہور: جاوید منزل، ۱۹۴۶ء)، ص: ک (دیباچہ)

۲۵۔ محمد اقبال، علامہ: کلیات اقبال، (لاہور: الفیصل ناشران و تاجرانِ کتب، ۲۰۱۴ء)، ص۲۸۷